رسائل و مسائل

اسلام اور جمہوریت پر سوالات

"میرے سامنے "اسلام اور جمہوریت" کی بحث کے سلسلے میں ایک سوالنامہ ہے۔ یہ سوالنامہ دراصل ایک روزنامے کی طرف سے بھجوایا گیا تھا۔ مگر بعد میں اس کے تحریر شدہ جواب مجھ سے وعدہ کے مطابق وصول نہیں کیے۔ اب مجھے خیال ہوا کہ اس بحث کو رسائل و مسائل ہی میں پیش کر دوں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے جوابوں کی صرف تمہیدی گفتگو دی جا سکی ہے، انشاءاللہ آئندہ سوالات اور جوابات اکٹھے درج کیے جائیں گے۔

(ن۔ ص)

میں آپ کے سوالوں کے جواب عرض کرنے سے پہلے آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ یہ بحث بہت پرانی ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں کوئی ربط ہے اور ہو سکتا ہے یا نہیں، اور ہو سکتا ہے تو کس صورت میں۔ اور اس بحث کا عملی طور پر بھی اور سیاسی دستوری طور پر بھی ایک بار فیصلہ ہو چکا ہے۔ لیکن آپ کے سوالات کا انداز ایسا ہے، گویا ان دنوں بالکل نئی بحث پیدا ہو گئی ہے اور کم سے کم آپ کی معلومات کے دائرے میں اس بحث کی پچھلی تاریخ نہیں ہے اور نہ آپ کو یہ علم ہے کہ نزاع کسی فیصلے پر پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ آپ ایک باصلاحیت صحافی ہیں اور میرے عزیز دوست، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا مستفسرانہ انداز یہ غمازی کرتا ہے کہ آپ کسی دور دراز علاقے سے نصف صدی بعد یکایک اس سرزمین میں وارد ہوتے ہیں اور چالیس پچاس سال کے فکری ارتقا کو بالکل نہ جانتے ہوئے بات کر رہے ہیں۔

بحث حسب ذیل نقطہ ہائے نظر میں تقریباً پچھلی پون صدی میں چلتی رہی ہے:۔

ا ۔۔ اسلام میں جمہوریت ہے اور وہ مغربی جمہوریت سے اعلیٰ تر ہے ۔

ب ۔۔ یہی جمہوریت جو مغرب میں چل رہی ہے، عین اسلام کے تقاضوں کے مطابق ہے، لہٰذا اسے لے کے چلنا چاہیے۔

ج ۔۔ اسلام میں جمہوریت نہیں ہے بلکہ وہ صرف اطاعتِ امیر چاہتا ہے ۔

د ۔۔ اسلام میں جمہوریت کے بجائے شورائیت کا سسٹم ہے۔ آگے اس کے متعلق تین رویں چلتی رہی ہیں: ایک یہ کہ امیر یا خلیفہ شوریٰ سے صرف مشورہ لینے کا پابند ہے۔ شوریٰ کی سو فیصد اکثریت کا متفقہ نقطۂ نظر بھی اُسے اس سے باز نہیں رکھ سکتا کہ وہ پورے عزم کے ساتھ اپنے پسندیدہ نقطۂ نظر کو نافذ کرے۔ دوسری یہ کہ بالعموم تو وہ اپنی مجلسِ شوریٰ کے متفقہ یا اکثریتی فیصلوں کا ساتھ دے گا مگر اسے ویٹو کا اختیار حاصل ہے جسے وہ حسبِ ضرورت استعمال کر کے اپنی مرضی سے مجلسِ شوریٰ کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ تیسری رائے یہ بھی سامنے آتی رہی کہ امیر کو لازماً مجلس شوریٰ کے متفقہ یا اکثریتی فیصلوں پر عمل کرنا چاہیے۔

عملاً مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دوسرے دینی اکابر کانگریس کے ساتھ، اور مولانا شبیر احمد عثمانی مغفور اور دیگر علما مسلم لیگ کے ساتھ کام کرتے رہے، اور یہ دونوں جماعتیں جمہوری ڈھانچے پہ کام کرتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں، تمام کارپوریشنیں، میونسپل کمیٹیاں، نوٹیفائڈ ایریاز کے کارپرداز ادارے، ڈسٹرکٹ کونسلیں، اوقاف اور رجسٹرڈ اداروں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز، یونیورسٹیوں اور اعلیٰ مدارس کے چلانے والی ہیئتیں، تجارتی کمپنیوں اور فرموں کے منتظمین، دیہات کی پنچائتیں، محلہ کمیٹیاں، غرضیکہ تمام شعبے کسی نہ کسی طرح کے جمہوری نقشے پہ چلتے رہے اور ان میں سے بیشتر کے لیے انتخابات بھی ہوتے رہے، کونسلوں کی نشستوں کے لیے ووٹ بھی دیتے جاتے رہے۔ اور ان کاموں سے اصحاب دین و تقویٰ بھی بالکل الگ نہیں رہے، بلکہ تحریک پاکستان کے زیر اثر ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں تو بھاری حصہ علماء اور مشائخ کا شامل تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ۔۔۔۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء کے انتخابات تک علماء اور اُن کی دینی جماعتوں اور مدرسوں نے جمہوری خطوط پہ کام کرنے والی سیاست میں دل کھول کر حصہ لیا۔ بلکہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حکومتی پارٹی کی رخنہ اندازی کا ردِ عمل جس طوفانی

تحریک کی شکل میں سامنے آیا اُس کا ہراول دستہ علماء تھے۔ اور اُن پر اعتماد کرنے والی دینی جماعتوں کا اتحاد!

اُدھر علمی دائرے میں ایک کام کرنے والے نے یہ کام کیا کہ ایک طرف یہ ثابت کیا کہ اسلام کے اُصولِ سیاست وحکمرانی آج کے دَور میں بھی بخوبی چل سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت نمایاں کی کہ خدا کی حاکمیت پر مبنی اور قانونِ شریعت کی پابندی میں کام کرنے والے اسلامی نظام کے اندر خود اپنے طرز کی اتنی اور ایسی جمہوریت موجود ہے کہ بادشاہت، آمریت اور استبدادی نظاموں سے ڈرے ہوئے لوگ اطمینان کے ساتھ اسے اپنا سکتے ہیں۔ اس مردِ حق کی بات واعظانہ طرز کی سرسری بات نہ تھی بلکہ اُس نے اسلام کا ایک مکمل سیاسی نظریہ کتاب وسنت سے اخذ کر کے ایسی زبان میں پیش کر دیا کہ جسے اِس زمانے کے دانشور اور نوجوان آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اور اس سے متاثر ہو سکتے تھے۔ اِدھر دینی حلقوں کی بھی خاصی تعداد مطمئن ہو گئی کہ اُن کے سامنے جو مبہم تصوّر تھا، اسے پرانی مذہبی سیاسی زبان اور اصطلاحات کے چکر سے نکال کر ایک شخص نے ایسی ترجمانی کر دی ہے جس سے بحث کے تمام ضروری اجزا روشن اور واضح ہو گئے ہیں۔ یہ شخص کون تھا؟ ـــــ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی رحمۃ اللہ علیہ۔

مودُودی صاحب کا پیش کردہ ایک گراں بہا نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں جمہوری حاکمیت نہیں ـــــ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تحت "جمہوری خلافت" (POPULAR VICEGERENCY) ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ کسی مذہبی طبقے کی پاپائی حکومت (THEOCRACY) نہیں، بلکہ خدا پرستانہ جمہوریت (THEO - DEMOCRACY) ہے۔ انہی دو اصولی حقیقتوں نے مغربی جمہوریت کو مسترد کر دیا۔ باقی صرف سیاسی مشینری رہ جاتی ہے جس میں آپ اگر اسلام کے اصولوں کو کارفرما کر دیں۔ اور ان اصولوں کی ضرورت کے مطابق خود مشینری میں بھی ردوبدل کر لیں تو ایک نئے طرز کی جمہوریت رونما ہو جائے گی۔

جہاں تک فی نفسہٖ اجتماعی معاملات میں تصوّرِ جمہوریت کا تعلق ہے، یہ ہمارے ہاں اوّل روز سے ہے۔ خود جمہور کی اصطلاح تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم میں رائج ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جمہور علماء یا جمہور مفسرین یا جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ دو ایک آدمی کوئی دعویٰ کر رہے ہیں، بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کسی قلیل تعداد کے استثنیٰ

کے سامنے بہت بڑی اکثریت کسی بات پر متفق یا ہم خیال ہے۔ اور یہ بات بجائے خود بڑا وزن رکھتی ہے کہ کسی قول یا امر کے حق میں یا خلاف فلاں خاص رائے جمہور علما، یا ماہرین کی ہے۔ زیادہ تعداد کے ہم خیال یا مجتمع ہونے کا ہمیشہ ایک وزن رہا ہے۔ بشرطیکہ وہ تعداد احمقوں اور مجرموں پر مشتمل نہ ہو اور جس امر پر اتفاق کیا گیا ہو، وہ واضح طور پر باطل یا ظلم یا گناہ نہ ہو۔ اسی طرح ہماری اپنی ہی ایک اصطلاح "اجماع" ہے۔ اجماع تام یہ ہے کہ کسی مجلس یا ادارے یا دائرہ علم کے تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہو جائیں۔ اور اجماعِ ناقص یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی اکثریت متفق ہو جائے۔ لیکن ہمارا لٹریچر گواہی دے گا کہ "اجماع" کو ہر دائرے میں اہمیت حاصل رہی ہے۔

اس جملہ معترضہ کو ایک طرف چھوڑ کر ہم پھر اوپر کے سلسلہ گفتگو کو برقرار رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی مغفور اگر محض واعظ ہوتے تو اسلامی جمہوریت و شورائیت پر تقریریں کرتے ہوئے خوب فصاحت کے دریا بہا دیتے مگر پلے کچھ نہ پڑنے دیتے۔ اگر مفتی ہوتے تو ان کا فریضہ اتنا ہی ہوتا کہ وہ کتاب و سنت میں مندرج احکام اور ان سے متعلق آثار اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں اپنا فتویٰ دے دیتے۔ یہ ان کا دردِ سر نہ ہوتا کہ موجودہ احوال و ظروف میں اس فتوے پر کس طرح عمل ہوگا۔ اور اسلام کی ہیئت سیاسیہ کن بنیادوں پر کس طرح استوار ہوگی، یا اس کام میں کیا خطرات ہو سکتے ہیں اور ان کا توڑ کیا ہے۔ ایسے سوالوں سے مفتی بالا تر ہوتا ہے۔

مولانا مودودی مغفور کو بہت بڑی فکری لڑائی لڑ کر یہ ثابت کرنا پڑا کہ اسلامی بنیادوں پر اگر جمہوری مشینری کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے تو یہ خلافِ اسلام نہیں ہے۔ انہیں یہ اطمینان دلانا پڑا کہ اس میں تھیاکریسی کے تسلط کا خطرہ نہیں ہے، نیز انہیں جدید طبقوں کے اس اندیشہ کا توڑ مہیا کرنا پڑا کہ اسلامی ہیئتِ سیاسیہ میں آمریت کا ظہور نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے جب کہ اس کا ازالہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔

یہ بحثیں عرصہ تک چلیں، یہاں تک کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والے اکثر ذہن "اسلام کے نظریہ سیاسی" کے یا تو خود داعی بن گئے، یا قائل یا حامی۔

کیسے ہوتے مؤثر کام ہی کی یہ برکت ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد جب یہ اندازہ ہوا کہ مغرب پرست سیکولر طبقے کے سیاست کار اور بیورو کریٹس یہاں ایک غیر دینی دستور مسلط کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

نومبر ۴۸ء میں مولانائے مغفور کے پیش کردہ چار نکاتی مطالبہ (بعد میں مزید نکات کا اضافہ بھی ہوا) کو نہایت تیزی سے دینی حلقوں کی تائید بھی حاصل ہوئی اور مسلم مزاج کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور اُن کے اداروں نے بھی حمایت میں زور صرف کیا۔ یہاں تک کہ اسلامی دستور کے لیے پُر زور تحریک جاری ہوگئی اور اس تحریک کے فتوحات میں پہلی چیز "قرارداد مقاصد" تھی جو مارچ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوئی۔

اِس تاریخی دستاویز کا بغور جائزہ لے کر ملاحظہ کیجیے یہ جس طرزِ فکر پر مبنی ہے وہ ٹھیک وہی ہے، جس کے لیے یہاں چند برس پہلے سے کام کیا جا رہا تھا اور اس کی دفعات کا "مطالبۂ دستورِ اسلامی" کے نکات سے ربط صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرارداد کا ڈھانچہ اسلامی بنانے کے ساتھ ساتھ دستوری خاکوں کا مزاج دوسرا اختیار کیا گیا۔ قرارداد کو گویا محض بطور لیبل استعمال کرنا مطلوب تھا۔ دستوریہ کی بنیادی اصول کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ قوم کے دباؤ کی وجہ سے مسترد ہوگئی اسی دوران میں سیکولر طبقے نے یہ چیلنج اُٹھایا کہ مختلف گروہوں کے علماء مل کر کوئی متفقہ دستوری نقشہ ہمیں بنا کر دیں تو پھر اس کے مطابق اسلامی دستور بنایا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ چیلنج پیش کرنے والوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ تو سرے سے امکان ہی نہیں کہ علماء کوئی متفقہ دستوری نقشہ دے سکیں۔ بلکہ لامتناہی بحثیں اور جھگڑے چل پڑیں گے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تمام نمایاں مدارسِ فکر کے نہایت سرکردہ ۳۱ علماء و مشائخ ہر حصۂ ملک سے کراچی میں جمع ہوئے اور انہوں نے غور و بحث کے بعد اسلامی دستور کے لیے ۲۲ اصولوں کا ایک خاکہ جنوری ۵۱ء میں پیش کر دیا۔ علماء کا یہ اجماع اپنی نوعیت کے لحاظ سے سیاسی و جمہوری دائرے سے متعلق تھا۔ اور اسلامی ریاست کے عملاً معطل ہو جانے کے بعد سے اس دائرہ میں علمی و فکری کام بھی کم ہوا ہے، نیز نئے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر نفاذِ احکام کے راستے نکالنے کا مسئلہ تھا۔ یہ علماء کا بڑا عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے اجتماعیات میں دَورِ جدید کے پیدا کردہ اداروں اور احوال کو ملحوظ رکھ کر اور اُن سے اثر پذیر ذہنوں کی مشکلات کا اندازہ کر کے صحیح ترین نسخہ مرتب کیا۔ سیکولر طبقوں کے چیلنج کا جواب جس عالی ظرفی اور وسعتِ نظر سے دیا گیا ہے۔ لوگ خادمانِ دین سے اس کی توقع کم ہی کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ اجماعی فیصلہ گویا تجدید و احیائے دین کی تاریخ کا ایک سنگِ میل تھا۔

واضح رہے کہ آج جو مولوی صاحبان جمہوریت و شورائیت کے موضوع پر عجیب عجیب فتوے دے رہے ہیں، اِن کے مقابلے میں وہ بہت بڑے بڑے علماء و مشائخ تھے اور ان کا اجتماع زیادہ نمائندہ اور سنجیدہ اجتماع تھا۔ اور اس اجتماع میں یہ نقطۂ نظر موجود ہی نہ تھا کہ ایوانِ حکومت کے رجحانات کی تائید کرنی ہے۔ اُن علماء نے اسلامی اصولوں کے تحت جمہوری ڈھانچے کو قبول کیا، نمائندہ ایوانوں کو قبول کیا، صدارت اور وزارت کے مناصب کو قبول کیا، اور انتخابات کو قبول کیا۔ کیا وہ حضرات ایمان اور علم اور تقوٰی میں کسی سے کم تر تھے؟ اُن کے اجماعی فیصلے کو بدلنے کے لیے رسائل کے اداریے اور منبر کے خطبات کافی نہیں ہیں۔ ویسا نمائندہ اجتماع بلوایئے اور اسی طرح کی فضا میں سنجیدگی سے متفقہ فیصلے کیجیے، اپنی بات دوسروں سے منوایئے یا دوسروں کی بات مانیے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

علماء کے اس کام کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری دستوری رپورٹ کو ملک نے ناپسند کیا۔ پھر انہی علماء نے دوبارہ جمع ہو کر اس رپورٹ میں تفصیلی ترامیم کیں اور بیچ میں سے اگر ہم غلام محمد کی مخالفِ دستور کارروائیوں کا باب حذف کر دیں تو یہی ترمیم شدہ رپورٹ تھی، جس پر ۱۹۵۶ء کا دستور مبنی تھا اور جسے ساری قوم میں زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ مگر دستور ۱۹۵۶ء کے خطرے کا سدِّباب کرنے کے لیے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا سامنے آگیا۔ پچھلا سارا کھیل ختم ہوا۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ایک لمبے زمانی تسلسل میں بھاری محنتوں سے اسلام کی ہیئت سیاسیہ کا تصور نمایاں کرنے کے لیے جو کام کیا گیا اور جس سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہوئے۔ اب چند مولوی صاحبان کے فتوؤں اور وعظوں کے تحت کیوں اس سارے کیے کرائے کو ختم کر دیا جائے اور نئے سرے سے اسلامی سیاست کے اصول طے کیے جائیں۔ یہ حضرات قوم کو یہ اُصول بتاتے ہیں کہ اسلام کا تقاضا بس یہ ہے کہ ایک امیر ہونا چاہیے۔ اور ایک شورٰی ہونی چاہیے جس کے مشوروں کو امیر چاہے تو قبول کرے، چاہے تو اپنا فیصلہ نافذ کرے۔ لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ امیر کہاں سے نمودار ہو گا؟ اس کے آنے کا دروازہ کونسا ہو گا؟ شورٰی کے ارکان کس طرح تلاش کیے جائیں گے؟ اور اگر امیر آمریت یا ملوکیت کی راہ پر چل پڑے تو چارۂ کار کیا ہو گا؟ اور امیر اور شورٰی کے علاوہ جو ۶، ۷ کروڑ بالغ شہری ملک میں موجود ہوں گے، کیا انہیں سیاسی اُمور سے لاتعلق رکھا جائے گا؟ —— تو یہ حضرات ان سوالوں کے جواب فراہم نہیں کرتے بلکہ

کہتے ہیں کہ بس جی ہمیں تو غرض اسلامی نظام سے ہے، ہم اسے پورا پورا چلادیں گے، آگے جو ہو سو ہو، ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

برادرم! آپ سوچیں، کیا ایسی باتوں سے دُنیائے سیاست میں کام چل سکتا ہے، اپنی قوم کو سمجھانا ہے، مذہبی لوگوں کے علاوہ بے مذہبوں کو بھی سمجھانا ہے، غیر مسلم اقلیتوں کو بھی مطمئن کرنا ہے، باہر کی اقوام کے سامنے بھی ثابت کرنا ہے کہ تمہارے عقلی اور افادی پیمانوں کے لحاظ سے بھی اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت بہتر و برتر ہی نہیں، موجودہ دور میں پوری طرح قابلِ عمل ہیں۔

ایک بڑے انسانی مسئلے کا جو حل بحث و تمحیص کے بعد چند برس سے یہاں راسخ ہو رہا تھا — اور جس کے خلاف پہلے کبھی بڑے سے بڑے علماء کی طرف سے بھی اس طرح کی کوئی نکتہ آفرینی نہیں ہوئی جیسی اب ہو رہی ہے — اُسے چند اصحاب مٹا کر ساری بحث نئے سرے سے چھیڑنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا حل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ دوسروں کے سامنے اسلام کا کوئی نظریہ اور ڈھانچہ پیش کر کے لوگوں کو مطمئن کرنا۔ اور اس سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کا وقیع حل فراہم کرنا دل و دماغ کی بڑی اُونچی صلاحیتیں چاہتا ہے۔

اب آپ سے میری گذارش یہی ہے کہ جس فراخ دلی سے آپ نے اپنے ہاں اس طے شدہ بحث کا کھاتہ از سرِ نو کھول دیا ہے۔ اس سے سوائے فکری انتشار کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ لیکن خیر کا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ جو لوگ اسلام کے منصوص اصول و مقاصد کو بھی جانتے ہیں۔ نئے دور کے مسائل اور اشکالات اور نو تشکیل یافتہ ادارات کی خوبیوں اور خرابیوں کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اس بحث کے ذریعے وہ اپنے موقف کو اور زیادہ قابل قبول بنا سکتے ہیں۔

مَیں کوشش کروں گا کہ اشاعتِ آئندہ میں آپ کے سوالات کے مختصر جواب عرض کر دوں۔